محمد اقبال

روسی محقق سید میرشکر کی کتاب مترجمہ کبیر احمد جائسی

کا

خصوصی مطالعہ

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

حیات چیست؟ جہاں را اسیرِ جاں کردن
تو خود اسیرِ جہانی، کجا توانی کرد؟

تاریخ ادب اردو اور تاریخ اقبالیات میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، سری نگر کی ادبی خدمات سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اس ادارے نے معیاری سیمیناروں کے انعقاد، توسیعی لیکچروں، بلند پایہ کتب اور اپنے سہ ماہی جریدے کی اشاعت سے جس طرح اقبالیات کو فروغ دیا ہے اس کی نظیر بھارت میں نہیں مل سکتی۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے پروگرام کا ایک قابل قدر حصہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دنیا کے اور حصوں میں بھی اقبال پر کام کا جائزہ لیا جائے اور اس سلسلے میں دوسری زبانوں میں چھپی ہوئی کتابوں کا اردو ترجمہ شائع کیا جائے۔

اس پروگرام کے تحت ایک ایرانی عالم ڈاکٹر علی شریعتی کی کتاب "علامہ اقبال مصلح قرن آخر" کا اردو ترجمہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب کے مترجم جناب کبیر احمد جائسی ہیں۔

اب تاجکستان کے ایک ممتاز ادیب اور شاعر میر ستید میرشکر کی کتاب "محمد اقبال" کا اردو ترجمہ اسی نام سے اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ بھی کبیر احمد جائسی نے کیا ہے۔ کبیر احمد جائسی کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر دسترس حاصل ہے۔ فارسی سے میری مراد ہے پرانی فارسی بھی اور جدید فارسی بھی۔ اس لیے ان کا فارسی سے اردو میں کیا ہوا ترجمہ شگفتہ بھی ہوتا ہے اور معیاری بھی۔ زیر نظر ترجمہ بھی اسی شگفتگی اور ادبی معیار کا حامل ہے۔

تاجکستان میں اقبال بہت مقبول ہیں۔ مجھے ۱۹۷۸ء میں تاجکستان جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں متعدد ادیبوں سے میری ملاقات ہوئی مثلاً آقائے سومن قناعت، آقائے فضل دین محمد یوف، آقائے عبداللہ جان غفارت، آقائے باقر رحیم زادہ، آقائے امین جان شکوہی، مرزا عبدالستار ترسون زادہ اور کئی دوسرے ادیب اور ان سب کو میں نے کلام اقبال کا گرویدہ پایا۔ آقائے فضل دین محمد یوف نے مجھے بتایا کہ بیدل کے بعد تاجکستان میں اقبال کی شہرت ہے اور اقبال کے بعد غالب کی اور یہ تینوں شاعر

یہاں بہت مقبول ہیں۔ اقبال کی تمام کتابیں تاجکستان میں چھپ چکی ہیں لیکن روسی رسم الخط میں۔

ان تینوں شاعروں کے نام پر وہاں تین ادبی انجمنیں قائم ہیں جن کے ہر ماہ اجلاس منعقد ہوتے ہیں چنانچہ انجمن اقبال کا بھی ہر ماہ دوشنبے میں اجلاس منعقد ہوتا ہے اور اس میں اقبال کے فکر و فن پر مقالے پڑھے جاتے ہیں

زیرِ نظر کتاب "محمد اقبال" دراصل میر سید میر شکر کا ایک دیباچہ ہے جو انہوں نے اقبال کے فارسی مجموعۂ کلام "پیامِ مشرق" کے لیے لکھا۔ یہ فارسی مجموعۂ کلام ۱۹۹۲ء میں دوشنبہ (تاجکستان) سے شائع ہوا۔ کتاب کے شروع میں پروفیسر آل احمد سرور کے پیش لفظ کے علاوہ کبیر احمد جاسی کا لکھا ہوا ایک مقدمہ ہے جس میں انہوں نے مقالہ نگار یعنی میر سید میر شکر کے حالات زندگی بیان کیے ہیں۔ بقول جاسی صاحب ان کے "مقدمہ" کا ماخذ ایک تو ہے مختصر ترجمہ حال خردم (صدر الدین عینی) دوسرا جمیع جرافی ما (الغ زادہ) اور تیسرا پنجاب یونیورسٹی لاہور کی شائع کردہ "اردو دائرہ معارف اسلامیہ"

کبیر احمد جاسی نے ان تینوں ماخذوں کو خاصے سلیقے سے برتا ہے اور میر سید میر شکر کی داستانِ حیات تفصیل سے بیان کی ہے۔ اگرچہ اس داستان کے بیشتر حصے کا موضوعِ کتاب سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ تاجکستان میں اقبال پہ لکھنے والے ایک اہلِ قلم کی زندگی کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ مثلاً میر سید میر شکر ایک نثر نگار ہونے کے علاوہ شاعر بھی ہیں صحافی بھی، نقاد بھی اور تمثیل نگار بھی۔ بچّوں کے لیے انہوں نے اتنا عمدہ اور مفید ادب تخلیق کیا ہے کہ انہیں صفِ اوّل کا بچوں کا ادیب تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی بھی سیاحت کی ہے اور ایک کتاب ہندوستان کے بچوں کے متعلق لکھی ہے جس کا نام ہے "بچگانِ ہندوستان"۔ وہ کچھ مدت تک جمہوریہ تاجکستان کے صدر بھی رہ چکے ہیں اور اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو فارسی رسم الخط سے آشنا ہے۔

اسی مقدمے میں میر سید میر شکر کا ذکر کرتے ہوئے کبیر احمد جائسی لکھتے ہیں کہ "میر سید میر شکر نہ تو اردو زبان سے واقف ہیں اور نہ ہی انگریزی سے۔ انہوں نے اقبال کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ صرف ان کے فارسی کلام کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ اس میں اقبال کے وہ خیالات، افکار و نظریات معرضِ بحث میں نہیں آ سکے ہیں جن کا اظہار اردو اور انگریزی زبانوں میں ہوا ہے"۔ لیکن اقبال نے اردو اور انگریزی میں بھی تو وہی افکار پیش کیے ہیں جو فارسی شاعری میں بیان کیے ہیں۔ ایسا تو ہے نہیں کہ اقبال کے اردو اور فارسی میں بیان کیے ہوتے خیالات یا انگریزی اور فارسی میں پیش کیے ہوتے افکار میں کوئی تضاد ہو۔ ارتقائے فکر کی بات دوسری ہے لیکن جب اقبال نے فارسی میں بھی وہی افکار اپنے قاری کے سامنے رکھے ہیں جو اردو اور انگریزی میں تو پھر اس منافق

جملے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اگر میر سید میر شکر اردو اور انگریزی سے آشنا ہوتے تو بھی میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کے متعلق وہ یہی لکھتے جو انہوں نے اب لکھا ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ بعض پہلوؤں سے میر سید میر شکر اور اقبال کے فکر میں بعد المشرقین ہے۔ اس امر کی جانب سرور صاحب نے پیش لفظ میں ہلکا سا اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :- " ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر شکر نے اقبال کے کلام کو خاص نقطۂ نظر سے دیکھا اور انہی پہلوؤں پر زور دیا جو ان کے اشتراکی نقطۂ نظر سے مستحسن قرار دیئے جا سکتے ہیں۔" سرور صاحب کی یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میر شکر نے اپنے خیالات کا جو کھٹا پہلے بنایا اور تصویر کو بعد میں اس میں سجانے کی کوشش کی حالانکہ فریم کے مقابلے میں تصویر کی اہمیت ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے اور فریم ہمیشہ تصویر کو سامنے رکھ کے بنایا جاتا ہے۔ مثلاً " اسرار خودی کے بارے میں میر شکر لکھتے ہیں :-

" محمد اقبال کا یہ خیال تھا کہ ان کا یہ "نیا اندازِ نگارش" استعمار گروں کے خلاف عوام کو دعوت جنگ دینے میں مددگار ہوگا مگر اس کا نتیجہ ان کی خواہش کے بالکل برخلاف نکلا۔ اس بات کا سبب یہ تھا کہ اقبال نے اس بات پر نظر نہیں رکھی کہ اسی اسلوبِ بیان کے ساتھ اس سرزمینِ ہندوستان میں جو کہ ان کی قالبِ اوّل ہے، گوناگوں مذاہب کے حامل عوام کو متحد کرنا اور ایک مقصد کے حصول کے لیے ہم صف کر کے آمادۂ جنگ کرنا حدِّ امکان سے باہر ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ اقبال کی فلسفیانہ منظومات " اسرارِ خودی" اور " رموزِ بے خودی" جن میں دینِ اسلام کے فائدے کو ملت کے فائدے پر ترجیح دی گئی تھی، ان کی خواہش کے برخلاف ہندوستان کے عوام کو متحد کرنے کے سلسلے میں یہی نہیں کہ کوئی خدمت نہ کر سکیں بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ انہیں منظومات کی وجہ سے اس راہ میں بہت سے روڑے سامنے آئے۔"

اس اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوتے کبیر احمد جائسی نے صحیح لکھا ہے کہ " میر شکر کا یہ انکشاف تاریخی حقائق سے میل نہیں کھاتا۔ اقبال نے نہ تو مذکورہ دونوں مثنویاں ہندوستانیوں کو متحد کرنے کے لیے لکھی تھیں اور نہ ہی ان مثنویوں کی وجہ سے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں کسی قسم کا باہمی مناقشہ سامنے آیا۔ یہ چیز ہماری فہم سے بالاتر ہے کہ جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے اس کو میر سید میر شکر کی نگاہوں نے کیسے دیکھ لیا۔"

اسی طرح اقبال کے ان اشعار

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی
حرفے زما بہ مجلسِ اقوام باز گوئے
دہقان و کشت و جوے و خیابان فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

کا تعلق براہ راست ہندوستان کی جنگِ آزادی سے نہیں ہے بلکہ "جاوید نامہ" کے ان اشعار کا تعلق صرف سرزمینِ کشمیر سے ہے۔

"اسرارِ خودی" پر بحث کرتے ہوئے سید سید میر شکر لکھتے ہیں :۔

محمد اقبال نے پردۂ اسرارِ زیست کو پارہ پارہ کرکے اور کارگاہِ ممکنات کے نہاں خانہ سے سرِّ تکوینِ حیات کو باہر نکال کر اس کا نام اسرارِ خودی رکھا۔ خودی یا خویشتن نظریہ، یعنی نظریہ ہے جو یونان سے سرزمینِ مشرق میں پہنچا ہے۔ اس نظریے کے شناور ناصر خسرو نے اپنی کتاب زاد المسافرین میں "اس (خودی) کی ماہیت کو مفصل طور سے بیان کیا ہے۔ اس نظریے کے مویدین کے نزدیک "نفسِ عاقلہ" عالی ترین چیز ہے جو روزِ ازل ہی سے موجود ہے اور جس پر یہ لازم ہے کہ وہ اس طرح ارتقاء پذیر ہوتا ہے کہ درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہوا کمال کے درجۂ اعلیٰ (خودی یا خویشتن) تک پہنچ جائے۔ جمادات، نباتات اور وہ حیوانات جن کی آخری اور کامل ترین شکل انسان ہے، سب ہی ارتقاء کی اس راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ درج ذیل جدول کے مطابق اس زمانے سے قبل جب کہ انسان نے اپنا عرفان حاصل نہیں کیا تھا صورتِ حال یہ تھی :۔

آمدہ اوّل بہ اقلیمِ جماد   وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد   وز نباتی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چوں بہ حیوانی فتاد   نامدش حالِ نباتی ہیچ یاد
باز از حیواں سوئے انسانیش   می کشید آں خالق کہ دانیش
ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت   تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ نظریہ اور اس کی ترقی کے سہ گانہ مدارج کا تصور زمانۂ قدیم ہی سے رائج تھا تو پھر بیسویں صدی کے شاعر نے اس بیش بہا افتادِ موضوع کو اپنے اظہارِ خیال کا ہدف کیوں بنایا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ کوئی کارِ تقلید ہے؟

یوں تو اس مسئلے پر جناب کبیر احمد جائسی نے بڑی مفصل بحث کی ہے لیکن میرے نزدیک یہ سوال اس لیے پیدا ہوا ہے کہ میر شکر نے ایک تو نفسِ عاقلہ کو خودی کے مفہوم کے ساتھ گڈ مڈ کر دیا ہے، دوسرا خودی کی تربیت کے سہ گانہ مراحل کو نظریۂ ارتقاء کے مختلف مدارج کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔

نفسِ عاقلہ نظریۂ ارتقاء کے مختلف مقامات میں ایک ارفع مقام ہے لیکن یہ خودی نہیں ہے، بلکہ خودی کا مقام اس سے بلند تر ہے اور خودی اپنی تربیت کے لیے ان سہ گانہ مدارج کی محتاج ہے جن کا ذکر اقبال نے ایک باب کے زیرِ عنوان ان الفاظ میں کیا ہے۔

"در بیانِ این کہ تربیت خودی راسہ
مراحل است ۔ مرحلۂ اول اطاعت
و مرحلۂ دوم راضبطِ نفس و مرحلۂ سوم
را نیابت الٰہی نامیدہ اند "

نفسِ عاملہ کا تعلق ان مدارج یا مراحل سے نہیں۔ نفسِ عاقلہ کا رشتہ تو جیسے مولانا روم کے مندرجہ بالا اشعار میں ہم دیکھتے ہیں، حیاتیاتی سلسلہ ارتقاء سے ہے جس کے مدارج یہ ہیں جمادات، نباتات، حیوانات، انسان (اور پھر انسان کے عاقل و دانا ہونے کو اس کا امتیاز بیان کیا گیا تھا) حیرت ہے ان مدارجِ ارتقاء کو میر سید میر شکر نے تربیت خودی کے مراحلِ سہ گانہ کیسے سمجھ لیا۔ اقبال کے نزدیک عقل کی فضیلت اور چیز ہے اور خودی بالکل ہی دوسرا جوہر۔ "ساقی نامۂ" (بالِ جبریل) میں جہاں اقبال یہ کہتے ہیں۔

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر
مری فطرت آئینہ روزگار
غزالانِ افکار کا مرغزار

وہاں وہ عقل کی فضیلت ہی کا ذکر رہے ہیں اور اس کے بعد والے بند میں زندگی کی ماہیت بیان کرتے ہوئے فرد کی انفرادیت پر زور دیتے ہیں اور اپنے قاری کو بتاتے ہیں کہ:

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عینِ محفل میں خلوت نشیں

یہاں اقبال یہ نکتہ بھی فاش کرتے ہیں کہ یہ وحدتِ حیات کثرتِ مظاہر میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے
یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول

اب اس کے بعد خودی کی ماہیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خودی کتنی شانوں کی حامل ہے کہیں یہ چاند کی کرن بن کر نمایاں ہوتی ہے اور کہیں پتھر میں شرر کی صورت اختیار کرتی ہے لیکن طرح طرح کی ان تمام اشکال اور صورتوں کے باوجود خود صورت سے پاک ہے
مراد اس ساری گفتار سے یہ ہے کہ خودی کی تربیت کے لیے نفسِ عاقلہ کا ہونا ضروری ہے لیکن نفسِ عاقلہ خودی نہیں ہے۔

دوسری بات خودی کے بارے میں میر سیّد میر شکر یہ کہتے ہیں :۔

ہندوستان و پاکستان ہو یا ایران و افغانستان سب ہی ممالک کے اقبال شناس حضرات اس سوال کا جواب دینے سے احتراز کرتے ہیں اور بالعموم "اسرار خودی" کے عالمِ تخلیق میں آنے کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ اقبال نے اسلامی فلسفیوں اور دانش مند شاعروں ، ناصر خسرو ، جلال الدین رومی اور بیدل کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی پیروی کرتے ہوئے انہی کے افکار و خیالات کو اسرار خودی میں نئے انداز اور نئی زبان میں بیان کر دیا ہے۔

معلوم نہیں ان چار ملکوں کے وہ کون سے اقبال شناس ہیں جن کا حوالہ میر سیّد میر شکر دے رہے ہیں ۔ کسی کے اقتباس کا علم ہو جاتا تو بات ہو سکتی تھی لیکن اس سے ملتے جلتے خیالات روسی مصنفہ مس ماریا اسٹیپنیٹس کے ہاں ان کی کتاب Pakistan Philosophy and Sociology. میں یقیناً ملتے ہیں ۔ راقم التحریر کی کتاب "نشانِ منزل" کے آخری مقالے میں اس پر مختصر سی بحث کی گئی ہے

خیر جلال الدین رومی اور اقبال کا معاملہ یہ ہے کہ اقبال رومی کو پیر و مرشد ماننے کے باوجود رومی کو پوری طرح یعنی صد فی صد قبول نہیں کرتے ۔ بے شک وہ یہ کہتے ہیں کہ :۔

چو رومی در حرم دادم اذان من
ازو آموختم اسرارِ جان من

به دورِ فتنۂ عصرِ کہن او
بدورِ فتنۂ عصرِ رواں من

اور "اسرار خودی" کی ابتدا میں یہ بھی کہتے ہیں۔

روئے خود بنمود پیرِ حق سرشت
کو بہ حرفِ پہلوی قرآں نوشت

اور اقبال کے الفاظ میں رومی اقبال سے یہ بھی فرماتے ہیں۔

از نیستاں ہم چو نے پیغام دہ
قیس را از قومِ حے پیغام دہ
نالہ را اندازِ نو ایجاد کن
بزم را از ہائے و ہو آباد کن

لیکن جہاں انجام کار مولانا روم کی "نے" نیستاں کا جزو بن جاتی ہے وہاں اقبال کے یہاں "نے" اپنی الگ ہستی برقرار رکھتی ہے۔ یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ "نے" رومی کے یہاں "انائے مقید کی علامت ہے اور رومی کے یہاں انائے مقید کا کمال یہ ہے کہ وہ انائے مطلق میں گم ہو جائے۔ لیکن اقبال کا نظریۂ خودی یہ نہیں ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

اے خوش آں جوئے تنک مایہ کہ از ذوقِ خودی
در دلِ خاک فرو رفت و بہ دریا نرسید

گویا رومی کے نزدیک جہاں انسانی انا یا انسانی خودی کی انتہا یہ ہے کہ وہ انائے مطلق کا جزو بن جائے وہاں اقبال کے نزدیک انسانی انا یا انسانی خودی کی انتہا یہ ہے کہ وہ انائے مطلق کا جزو نہ بنے بلکہ اپنی ہستی الگ برقرار رکھے۔

اقبال کے یہاں "اندازِ نو" اور "طرزِ دیگر" ایسی ترکیبیں بڑی معنی خیز ہیں اور قاری کی پوری توجہ کی مستحق ہیں۔ اب اس مذکورہ شعر میں جب اقبال اپنے لیے رومی کی زبان سے یہ کہلاتے ہیں

نالہ را اندازِ نو ایجاد کن

تو "اندازِ نو" سے وہ نئے اسلوب کی شاعری مراد نہیں لیتے بلکہ وہ اس خوبصورت ترکیب کے پردے میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میرے نزدیک نے اور نیستاں کا باہمی رشتہ وہ نہیں ہے۔ جو رومی کے نزدیک ہے اور میں "نے" اور "نیستاں" یعنی انائے مقید اور انائے مطلق کے جس رشتے اور باہمی تعلق کو پیش کروں گا وہ رومی کے بیان کیے ہوئے رشتے سے مختلف ہوگا......
یہ ہے اندازِ نو

ایسی ہی مثال ہمیں اس وقت بھی ملتی ہے جب اقبال محمود شبستری کی مثنوی "گلشن راز" کا جواب لکھتے ہیں وہاں بھی چونکہ وہ فنافی اللہ اور فنافی الرسول سے وہ مفہوم مراد نہیں لیتے جو شیخ محمود شبستری نے لیا ہے اس لیے کہتے ہیں:

بطرز دیگر از مقصود گفتم   جواب نامۂ محمود گفتم

گویا اقبال کا فلسفۂ خودی رومی کے فلسفۂ خودی کا نتیجہ ہے نہ کورانہ تقلید بلکہ اقبال کا فلسفہ رومی کے فلسفے سے خاصی حد تک مختلف ہے

میر سید میر شکر نے یہی بات ناصر خسرو اور بیدل کے تعلق سے بھی کہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال ان دونوں مفکر شعراء سے بہت متاثر ہیں۔ بیدل کی شاعری کا اقبال پر جو اثر ہے اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ بیدل کے بارے میں انھوں نے اظہار خیال تو بہت بعد میں کیا لیکن ان کے ابتدائی کلام میں بیدل کا جو خاموش اثر نظر آتا ہے وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بادِ صبح پھول کی شاخ پر یا پھول پر اثر انداز ہوتی ہے۔

تصویرِ درد (۱۹۰۴ء) کے پہلے بند کا آخری شعر بیدل ہی کا ہے۔

دریں حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم
ز فیضِ دل طپیدن ہا خروشِ بے نفس دارم

اور پھر اسی نظم کے دو اور شعر بیدل کے آئینہ اشعار میں دیکھئے

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے
کنوئیں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل جو مطلق تھا مقید کر دیا تو نے   (اقبال)

بیدل فرماتے ہیں۔

پشت و روئے صفحۂ اوراکِ تست اسلام و کفر
سطرِ قرآں را ز کج بینی چلیپا کردۂ
حُسنِ مطلق را مقیّد تا کجا خواہی شناخت
آہ ازاں یوسف کہ در چاہش تماشا کردۂ

اس کے بعد بیدل کے ان اشعار کی تضمین

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش   (بانگِ درا)

دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود ایں چمن
رنگِ مے بیروں نشست از بس کہ مینا تنگ بود (ضربِ کلیم)

اور پھر غالب کے مقابلے میں بیدل کے فلسفے کو حرکی کہنا اس بات کی دلیلیں ہیں کہ اقبال بیدل کے فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ نظری دونوں کے قائل تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ نظریہ خودی کی جھلک کلام بیدل میں جا بجا موجود ہے لیکن اقبال کے یہاں اس نظریئے کی جھلک نہیں ہے، اقبال کے یہاں یہ پورا ایک فکری نظام ہے جو بیدل کے یہاں موجود نہیں ہے۔

ناصر خسرو بھی اقبال کے پسندیدہ شعرا میں سے ہیں اور اس سبب دونوں کی فکری مماثلت ہے۔ ناصر خسرو کے یہاں فلسفۂ عمل کی اہمیت جا بجا اجاگر ہوتی ہے۔ ناصر خسرو کا بھی اقبال کی نظر میں بڑا اونچا مقام ہے۔ اور اسی لیے اقبال نے ناصر خسرو کی پوری غزل "جاوید نامہ" میں شامل کی ہے۔ یہ غزل اس مقام پر آتی ہے جب زندہ رود (اقبال) نادر شاہ کو ایران کے بارے میں یہ بتاتے ہیں کہ اب یہ ملک

نقشِ باطل می پذیرد از فرنگ
سرگذشتِ خود بگیرد از فرنگ

اور

آہ احسانِ عرب نشناختند
ز آتشِ افرنگیاں بگداختند

اور اس غزل پر اقبال نے یہ عنوان دیا ہے

نمودار می شود روحِ ناصر خسرو و غزلے مستانہ سرائیدہ غائب می شود۔

اس غزل میں اقبال نے ناصر خسرو کی زبان سے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ عمل کے بغیر علم اور علم کے بغیر عمل دونوں بیکار ہیں۔ قوموں کی ترقی کے لیے "تلوار اور قلم دونوں ضروری ہیں

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اقبال نے رومی یا ناصر خسرو یا بیدل کی "کورانہ تقلید" کی اور بیسویں صدی کے شاعر نے اس پیش پا افتادہ موضوع کو اپنے اظہارِ خیال کا ہدف بنایا

مزے کی بات یہ ہے کہ میر سید میر شکر خود اپنے مندرجہ بالا خیال کی تردید ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اقبال نے صرف "تعبیرِ تازہ" کے ذریعے جلال الدین رومی کے افکار کو بیان کر دیا ہے۔

اور بس

معلوم نہیں میر شکر "تعبیر تازہ" سے کیا مراد لیتے ہیں حالانکہ جہاں تک نظریہ خودی کا تعلق ہے اقبال کا کمال رومی کے نظریۂ خودی کی "تعبیر تازہ" ہی میں پنہاں ہے جس کا ہلکا سا ذکر اوپر کی سطور میں کیا جا چکا ہے۔

میر سید میر شکر نے اقبال کی شاعری کے چار ادوار قائم کیے ہیں۔ پہلے دور کے متعلق وہ لکھتے ہیں :۔ "یہ شاعری کی ایجادات و اختراعات کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ اس دور میں وہ بنیادی طور پر اردو میں اشعار لکھتے ہیں"۔

"دوسرے دور کے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ" اقبال کے دو مجموعے "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" ان کے ایجادات و اختراعات کے دوسرے دور کی پیداوار ہیں"

تیسرا دور بقول میر سید میر شکر اس زمانے سے عبارت ہے "جس نے تمام دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا" یہاں میر شکر کا اشارہ روس کے اشتراکی انقلاب کی طرف ہے اور چوتھا دور ان کے نزدیک وہ ہے جس میں "تخلیقات دو زبانوں اردو اور فارسی لکھی گئیں"۔

کلام اقبال کی اس طرح چار ادوار میں تقسیم محلِّ نظر ہے۔ جہاں تک روس کے اشتراکی انقلاب کا تعلق ہے اس موضوع پر اقبال کی نظمیں "خضرِ راہ" (۱۹۲۱ء) سے شروع ہو کر "ضرب کلیم" (۱۹۳۶ء) تک پہنچتی ہیں اور "ضرب کلیم" علامہ کے انتقال سے دو برس قبل منظرِ عام پر آئی۔ اس طرح اس مفروضہ دور کا چوتھا دور قرار دینا اور یہ کہنا کہ "تخلیقات دو زبانوں اردو اور فارسی میں لکھی گئیں" تحقیق کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ اقبال کی اردو اور فارسی شاعری قریب قریب ساتھ ساتھ ہی چلتی ہیں اس ضمن میں سر عبدالقادر کا یہ کہنا کہ

> "ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی کہتے ہیں یا نہیں۔ انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ انہوں نے سوائے ایک آدھ شعر کہنے کے، فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی، مگر کچھ ایسا وقت تھا۔ اور اس فرمائش نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آ کر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے اور صبح اٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں جو انہوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ ان غزلوں کے کہنے سے انہیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا.....
>
> یہ ان کی شاعری کا تیسرا دور ہے ۱۹۰۸ء کے بعد سے شروع ہوا۔"

اقبال کی فارسی گوئی کی ابتدا کے متعلق حقائق کی تصویر پیش نہیں کرتا۔ لندن کی مذکورہ محفل میں اقبال کے اس بیان سے کہ انہوں نے سوائے ایک آدھ شعر کہنے کے فارسی لکھنے کی کوشش نہیں یا بعد میں ایک

موقعے پر کہے ہوئے اس جملے سے کہ "اب اردو میں شعر نازل ہی نہیں ہوتے" یہ مراد لینا کہ اب اردو میں شعر کہنا ترک ہو چکا ہے اپنے آپ کو حقیقت سے بہت دور لے جانے کے مترادف ہے یہ محض اتفاقیہ (Casual) قسم کے جملے ہیں ان کے ساتھ تاریخی یا تحقیقی اہمیت وابستہ نہیں کرنا چاہیئے سر عبدالقادر مرحوم نے جس محفل کا ذکر کیا ہے اس میں اقبال نے محض منکسرانہ طور پر ایسا کہہ دیا ہو گا ورنہ ابتدائی اردو کلام میں فارسی اشعار کی شمولیت (اقبال کے اپنے اشعار کی، نہ کہ تضمین کے اشعار کی) اس قیاس پر دلالت کرتی ہے کہ اقبال شروع ہی سے اردو کے ساتھ ہی فارسی میں شعر کہتے چلے آ رہے ہیں۔

۱۹۰۲ء میں انہوں نے انجمن حمایتِ اسلام (لاہور) کے اجلاس میں ایک نظم پڑھی "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے"۔ اس نظم میں گیارہ اشعار کا ایک پورا بند فارسی میں ہے اور یہ گیارہ اشعار نعتیہ اشعار ہیں۔ ان اشعار کی پختگی اور شگفتگی سے با آسانی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ اشعار محض اتفاقیہ طور پر نہیں ہو گئے بلکہ ان کے پیچھے فارسی میں شعر کہنے کی ایک لگن اور مسلسل مشق موجود ہے جس کے بغیر اتفاقیہ طور پر غزل کا اکا دکا شعر تو ممکن ہے لیکن حسنِ بیان، حسنِ معنی، مضمون آفرینی اور صنائع بدائع پر مشتمل گیارہ شعر کی نعت کہنا ممکن نہیں یہ الگ بات ہے کہ ابتدائی دور کا فارسی کلام اقبال نے ضائع کر دیا ہو یا کسی وجہ سے ہمارے سامنے نہ آسکا ہو۔

اس نظم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر بند کا ٹیپ کا شعر فارسی میں ہے۔ گویا اس گیارہ اشعار پر مشتمل نعت کے علاوہ مندرجہ ذیل آٹھ مزید اشعار فارسی میں ہیں۔

صبر را از منزلِ دل پا بجولاں کردہ ام — گیسوئے مقصود را آخر پریشاں کردہ ام
باز اعجازِ مسیحا را ہویدا کردہ ام — پیکرے را از زبانِ خامہ گویا کردہ ام
یوسفِ علم استم و پنجاب کنعانِ من است — از دمِ صبحِ حکمت چاک دامانِ من است
از خمِ حکمت بروں کردم شرابِ ناب را — ہاں مبارک سرزمینِ خطۂ پنجاب را
گوش را جویائے آوازِ خبر یاں کردۂ — شانہ را مائل بہ گیسوئے پریشاں کردۂ
روشن از نورم مہِ حکمت شبستانِ من است — کاں دُرِ گم گشتۂ مومن بدامانِ من است
خویش را مسلم ہمی گویند و با ما کار نیست — رشتۂ تسبیح شاں جز رشتۂ زنار نیست
اے کہ حرفِ اطلبوا ولو کان بالصین گفتۂ — گوہرِ حکمت بہ تارِ جانِ اُمت سفتۂ

اسی طرح ۱۹۰۲ء کی ایک اور نظم ہے جس کا عنوان ہے "شکریہ انگشتری" اس نظم کے دو بند ہیں اور دوسرا بند جو سولہ اشعار پر مشتمل ہے فارسی میں ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۰۲ء کی ایک اور نظم "ابرِ گہربار" میں بھی فارسی اشعار موجود ہیں۔ سپاسِ جنابِ امیرؑ ۱۹۰۴ء کی نظم ہے جو جنوری ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی۔ یہ نظم

فارسی ہے اور جو تیس اشعار پر مشتمل ہے منشی محمد دین فوق کی کتاب "شالامار باغ" کے متعلق کہا ہوا فارسی قطعہ تاریخ ۱۹۰۱ء کا ہے۔ اب اس فارسی کلام کے پیش نظر سر عبدالقادر مرحوم یا میر سید میر شکر کی اس بات کو کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ اقبال کی فارسی شاعری ۱۹۰۸ء سے یا ۱۹۱۵ء سے شروع ہوتی ہے۔

گویا میر سید میر شکر کا اسرار خودی (۱۹۱۵ء) اور رموز بے خودی (۱۹۱۸ء) کی شاعری کو دوسرے دور کی شاعری قرار دینا صحیح نہیں۔ اگر ہم فارسی کلام کے اس دور کو دوسرا دور تصور کر لیں تو "بانگ درا" کی ۱۹۲۱ء، ۱۹۲۲ء تک کی شاعری جس میں خضر راہ اور طلوع اسلام ایسی نظمیں شامل ہیں اس دور شریک ہوں گی۔ کیوں کہ بقول میر شکر پہلا دور (اردو شاعری پر مشتمل) تو ۱۹۱۳ء، ۱۹۱۴ء تک آ کر ختم ہو گیا۔ چنانچہ کلام اقبال کی چار ادوار میں تقسیم بے بنیاد اور بے مقصد ہے۔

مقالے کا آخری حصہ اقبال کی شاعری کے بارے میں ہے اور اس میں بھی زیادہ زور اقبال کے نظریۂ شعر پر دیا گیا ہے اقبال کے محاسن شعری سے بحث نہیں کی گئی۔ جب ہم اقبال کی شاعری کی بات کرتے ہیں تو ہمارے سامنے سوال کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعری کے متعلق اقبال کا نظریہ کیا ہے اور دوسرا یہ کہ اس نظریے کو اقبال نے اپنی شاعری میں کس طرح برتا ہے اور وہ نظریہ خود شعری تجربے میں تبدیل ہو گیا ہے یا نہیں۔ ہمارے زیادہ تر نقاد اس ثانی الذکر پہلو کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شاعر کے طور پر مرتبۂ اقبال کے تعین کا کام بڑی حد تک ابھی باقی ہے۔ میر سید میر شکر نے اقبال کے نظریۂ شعر سے بحث کی ہے شعر اقبال کے محاسن یا معائب سے نہیں۔

اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے حال ہی میں سرور صاحب نے اقبال کی شعریات پر دو ایک سیمینار منعقد کیے ہیں۔ ان سیمیناروں میں پڑھے ہوئے مقالات پر مشتمل کتابیں جب چھپ جائیں گی تو خاصی حد تک مذکورہ کمی کو پورا کریں گی۔

کتاب کے آخر میں کوئی اڑتالیس صفحات تعلیقات کے لیے وقف کیے گئے ہیں جن کا اضافہ کبیر احمد جائسی نے اپنی طرف سے کیا ہے۔ غالباً چھپن صفحات کا فکر و معانی سے لبریز مقدمہ لکھنے کے بعد جائسی صاحب تھک گئے ہیں اس لیے انہوں نے یہ تعلیقات کسی انسائیکلوپیڈیا میں اندراج کے انداز پر لکھ ڈالی ہیں۔ اوّل تو ان تعلیقات کی ضرورت ہی نہیں تھی مثلاً جیتندر کمار اور پرویز شاہدی پر تین تین چار چار صفحے اس کتاب میں لکھنا جو اقبال کے متعلق ہے بالکل ایک لاتعلق سی بات ہے۔ ہاں بائرن، بیدل، کانٹ، کومتے، گوئٹے، لینن، ٹالسٹائی، مارکس، ناصر خسرو اور ہیگل پر تعلیقات کی اہمیت ہو سکتی ہے لیکن صرف اس صورت میں کہ ان دانشوروں کے ساتھ اقبال کے ذہنی قرب و بُعد پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ موجودہ صورت میں ان تعلیقات کا کتاب کے ساتھ کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔

کتاب نہایت عمدہ کاغذ پر بہت ہی خوبصورت چھپی ہے اور بڑی حد تک کتابت و طباعت کی اغلاط سے پاک ہے لیکن کہیں کہیں کتابت و طباعت کی بعض ایسی اغلاط موجود ہیں جو اگر نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔ مثلاً صفحہ ۵۱ پر ایک مصرعہ درج ہے

رومی خود بنماید پیر حق سرشت

اصل مصرعہ یوں ہے۔

رومی خود بنمود پیر حق سرشت

صفحہ ۹۰ پر ایک مصرعہ یوں درج ہے

بیا کن گوشۂ چشم کہ در شوق

صحیح مصرعہ یہ ہے

بیا کن گوشۂ چشمے کہ در شرق

صفحہ ۸۷ پر ایک مصرعہ درج ہے

فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

صحیح مصرعہ ہے

فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

لیکن اردو کی کسی کتاب کا اس طرح کی کتابت و طباعت کی اغلاط سے پاک ہونا ممکن نہیں۔

آخر میں ایک بار پھر اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ کبیر احمد صاحب جائسی نے اصل کتاب کا ترجمہ کرنے میں جو محنت صرف کی ہے قابل تعریف ہے بالخصوص جب ہم دیکھتے ہیں کہ اصل فارسی کتاب روسی رسم الخط میں چھپی ہے۔ جائسی صاحب نے اس ہفتخواں کو کن کن مشکلوں سے طے کیا ہوگا اس کا اندازہ آسان نہیں، کیونکہ پہلے یہ ساری کتاب فارسی رسم الخط میں منتقل ہوئی اور پھر اردو میں۔

ہندوستان اور پاکستان سے باہر اقبال پر جو کام ہو رہا ہے اس سے ہند و پاکستان کی اردو دنیا کا آشنا ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر کی کوششوں کو یقیناً قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اس وقت تک اقبال انسٹی ٹیوٹ نے اس طرح کی دو کتابیں شائع کی ہیں امید کی جاتی ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور دنیا کے مختلف ادیبوں کا اقبال پر کام اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے سے ہمارے سامنے آتا رہے گا۔

حواشی

لہ اس تربیت کے جو مذکورہ مراحل سہ گانہ پر مبنی ہے ۔ اندیشہ اس بات کا ہے کہ خودی یزید کی خودی بن جائے ، حضرت امام حسین کی خودی نہ بن سکے ، نتھو رام گاڈسے کی خودی بن جائے اور مہاتما گاندھی کی خودی نہ بن سکے ۔

ٹے دست را چوں مرکب تیغ و قلم کردی مدار … ہیچ غم گر مرکب تن لنگ باشد یا عرن
از سر شمشیر و از نوک قلم زاید ہنر … اے برادر ہمچو نور از نار و تار از نارون
بے ہنرداں نزد بے دیں ہم قلم ہم تیغ را … چوں نباشد دیں نباشد کلک را آہن رانحن
دیں گرامی شد بہ دانا و بنا داں خوار گشت … پیش ناداں دیں چو پیش گاو باشد یاسمن

ہمچو کرپاسے کہ از یک نیمہ زو الیاس را
کرتہ آید و ز دگر نیمہ یہودی را کفن

(ناصر خسرو)

سلہ اے کہ بر دلہا رموز عشق آساں کردۂ … سینہ ہا را از تجلی یوسفستاں کردۂ
اے کہ صد طور است پیدا از نشان پائے تو … خاک یثرب را تجلی گاہِ عرفاں کردۂ
اے کہ ذات تو نہاں در پردۂ عین عرب … رمزِ خود را در نقاب میم پنہاں کردۂ
اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک … بزم را روشن ز نور شمع عرفاں کردۂ
اے کہ ہم نام خدا باب دیار علم تو … اُمیئے بودی و حکمت را نمایاں کردۂ
آتش الفت بہ دامان ربوبیت زدی … عالمے را صورت آئینہ حیراں کردۂ
فیض تو دشت عرب را مطلع انوار ساخت … خاک ایں ویرانہ را گلشن بہ داماں کردۂ
دل نخالد در فراق ماسوائے نور تو … خشک چوبے را ز ہجر خویش گریاں کردۂ
گل فرستادن بہ بحر بیکراں می زیبدش … قطرۂ بے مایہ را ہم دست طوفاں کردۂ
بے عمل را لطف تو لاتقنطوا آموز گشت … بسکہ وا بر ہر کسے باب دبستاں کردۂ

باں دعا کن بہر ما اے مایۂ ایمان ما
پُر شود از گوہر حکمت بہر دامان ما